(4) تفسیر کبیر، ۹۲۶/۱، (دار احیاء التراث العربی، بیروت، ۱۴۱۵ء)

(5) فی ظلال القرآن تفسیر سورۃ الفلق ۶، ۱۱۷/۶، (ادارہ منشورات اسلامی ملتان روڈ، لاہور، ۱۹۹۸ء)

(6) مذہبی داستانیں اور ان کی حقیقت، ۹۳/۲، (الرحمن پبلشنگ ٹرسٹ، کراچی، ۱۹۸۹ء)

(7) صحیح بخاری کا مطالعہ، ۸۶/۲-۸۷، (فاؤنڈیشن فار اسلامک اسٹڈیز، میرٹھ، انڈیا، ۲۰۰۲ء)

(8) مقام حدیث، ص: ۱۹۹، (ادارہ طلوع اسلام 25/بی گلبرگ، لاہور، 2001ء)

(9) اسلام کے مجرم، ص: ۹۸، (گلیکسی پبلی کیشنز، بلوچستان)

(10) مقالات سرسید، مقالہ بعنوان ''سحر''، (مرتب: مولانا محمد اسماعیل پانی پتی) ۳۰۶/۳-۳۰۹، (مجلس ترقی ادب، لاہور، ۱۹۹۲ء)

(11) زاد المعاد، فصل غزوہ بنی النضیر ۴۱۵/۳

(12) الطب النبوی، ص: ۹۸، (دار الفکر، بیروت)

(13) فتح الباری، کتاب الطب، باب السحر، ۲۳۷/۱۰

(14) الطب النبوی، ص: ۱۰۰، (دار الفکر، بیروت)

(15) المستصفیٰ من علم الاصول، ۴۱۸/۲، (تحقیق: الدکتور محمد سلیمان الاشقر، موسسۃ الرسالۃ، الریاض، ۱۹۹۷ء)

(16) مسلم، کتاب فضائل القرآن، باب الامر بتعهد القرآن، ح: ۱۸۳۸، ص: ۳۱۹

(17) مسلم، کتاب المساجد، باب سہو فی الصلاۃ والسجود لہ، ح: ۱۲۷۴، ص: ۲۳۰

(18) دفاع عن السنۃ، ص: ۲۶۵، (دار اللواء للنشر والتوزیع، الریاض، ۱۹۸۷ء)

(19) فتح الباری، کتاب الطب، باب السحر ۲۲۶/۱۰-۲۲۷

(20) تفہیم القرآن، ۶/ ۵۵۳-۵۵۵، (ادارہ ترجمان القرآن، لاہور، ۲۰۰۳ء)

....

تحویل قبلہ

محمد اعظم سعیدی
مہتمم جامعہ اسلامیہ کورے وال، کراچی

ولئن اتیت الذین اوتوا الکتب بکل ایۃ ما تبعوا قبلتک ج وما انت بتابع قبلتھم ج وما بعضھم بتابع قبلۃ بعض ولئن اتبعت اھواء ھم من بعد ما جاءک من العلم انک اذا لمن الظلمین۔

ترجمہ: اور اگر آپ اہل کتاب کے پاس ہر قسم کی نشانی لے کر آئیں تو بھی وہ آپ کے قبلہ کی اتباع نہیں کریں گے اور نہ آپ ان کے قبلہ کی پیروی کرنے والے ہیں، اور نہ وہ ایک دوسرے کے قبلہ کی پیروی کرتے ہیں۔ اور (اے سننے والے) علم حاصل ہو جانے کے بعد اگر تو نے ان کی خواہشات کی اتباع کی تو بے شک تو بھی بے انصافوں میں سے ہوگا۔ (البقرہ آیت ۱۴۵)

یہاں بکل ایۃ سے مراد ہر قسم کی دلیل یا ہر ایک نشانی ہے یعنی آپ ان اہل کتاب کے سامنے ہر قسم کی قوی سے قوی تر نشانی بھی پیش کر دیں۔ یا مضبوط سے مضبوط دلائل بھی دے دیں بلکہ توریت وانجیل میں لکھا ہوا بھی ان کو پڑھوا دیں تب بھی یہ آپ کے قبلہ کو نہیں مانیں گے۔ کیونکہ دلائل وبراہین اور علامات ونشانات سے شک وشبہات تو دور کیے جا سکتے ہیں مگر حسد، عناد اور ہٹ دھرمی کو دور نہیں کیا جا سکتا۔ آپ کے قبلہ کی عدم پیروی یہ ان کی ضد وہٹ دھرمی ہے ورنہ یہ بات ان کی کتابوں میں موجود ہے کہ تحویل قبلہ کا حکم حق ہے۔ اللہ تعالیٰ کا سب سے پہلا گھر بیت اللہ شریف ہے اور یہی حضرت ابراہیم علیہ السلام کا قبلہ ہے اور جو مبعوث ہونے والا نبی ہے وہ ملت ابراہیمی کا پیروکار ہوگا اور ذو قبلتین ہوگا۔

قبلہ کے لفظی معنی ہیں، سمت توجہ، جس طرف رخ کیا جائے (معارف القرآن ج ا سورۃ بقرہ زیر آیت ۱۴۲)

القبلہ۔ بالمقابل آدمی کی حالت کو کہا جاتا ہے اور عرف میں اس جہت کو قبلہ کہا جاتا ہے جس کی طرف متوجہ ہو کر نماز پڑھی جاتی ہے (مفردات امام راغب مترجم محمد عبدہ فیروز پوری ج ۲ ص ۸۲۵)

قبلہ۔ بروزن فعلہ، سامنے کی چیز یا سامنے کی جہت، یا اس حالت کو کہتے ہیں جو کسی کے سامنے ہونے سے پیدا ہو، اسی لیئے پیشوائی کرنے کو استقبال اور دشمن کے سامنے آنے کو مقابلہ کہتے ہیں۔ قبلہ کو قبلہ اسی لیئے کہتے ہیں کہ وہ نمازی کے سامنے ہوتا ہے (کبیر روح البیان بحوالہ تفسیر نعیمی سورہ بقرہ زیر آیت ۱۴۲)

اللہ تعالیٰ نے فرمایا ولکل وجھة ھو مولیھا (ہر ایک کے لیئے ایک سمت ہے جسکی طرف وہ منہ کرتا ہے۔ بقرہ آیت ۱۴۸) یعنی ہر ایک کے لیئے ایک قبلہ ہے جسکی طرف منہ کر کے وہ نماز ادا کرتے ہیں جیسے حاملین عرش یعنی مقربین ملائکہ کا قبلہ عرش اعظم ہے، روحانیین یعنی ملائکہ بررہ کا قبلہ کرسی ہے، کروبیون یعنی ملائکہ سفرہ کا قبلہ بیت المعمور ہے۔ حضرت آدم سے لے کر حضرت موسیٰ علیہما السلام تک جملہ پیغمبروں کا قبلہ بیت اللہ ہے۔ حضرت سلیمان علیہ السلام سے حضرت عیسیٰ علیہ السلام تک اکثر انبیائے بنی اسرائیل کا قبلہ بیت المقدس تھا جبکہ حضور اکرم ﷺ کا قبلہ بیت اللہ ہے۔ (تفسیر کبیر ج ۱ ص ۲۷ مطبوعہ دار الفکر بیروت)

حضرت آدم علیہ السلام کو جب دنیا میں اتارا گیا تو فرشتوں کے ذریعے بیت اللہ کی بنیاد پہلے ہی رکھ دی گئی تھی اسی طرف قرآن مجید نے یوں اشارہ فرمایا ہے۔ ان اول بیت وضع للناس للذی ببکة مبرکا (سب سے پہلا گھر جو لوگوں کے لیئے بنایا گیا مکہ میں وہ بہت ہی برکت والا ہے۔ القرآن)

پھر آدم علیہ السلام نے پانچ مختلف پہاڑوں یعنی طور سینا، طور زیتا، کوہ جودی، کوہ لبنان اور کوہ حراء سے پتھر لے کر فرشتوں کی قائم کردہ بنیادوں پر بیت اللہ کی تعمیر فرمائی تھی (پھر بعد کے مختلف ادوار میں مختلف پیغمبروں سے نسبت پا کر یہ پہاڑ بھی دائمی عظمت سے مشرف ہو گئے، طور سینا حضرت موسیٰ علیہ السلام سے منسوب ہوا۔ کشتی نوح علیہ السلام کوہ جودی پر رکی، حضرت ابراہیم علیہ السلام نے عراق سے مصر جاتے ہوئے کوہ لبنان پر قیام کیا تو کوہ حرا حضور اکرم ﷺ کا مرکز گوشہ نشینی تھا)۔

حضرت آدم علیہ السلام سے حضرت نوح علیہ السلام تک (بقول صاحب تفسیر نعیمی آدم سے موسیٰ علیہما السلام تک) تمام پیغمبروں اور ان کی امتوں کا قبلہ یہی بیت اللہ شریف رہا۔ طوفان نوح میں بیت اللہ کی دیواریں منہدم ہو گئی تھیں۔ پھر عرصہ دراز بعد حضرت ابراہیم و حضرت اسماعیل علیہما السلام نے اللہ تعالیٰ کے حکم سے انہی بنیادوں پر اسکی دوبارہ تعمیر فرمائی اور یہی آپ کا اور آپ کی ملت کا قبلہ رہا۔

جب قریش مکہ نے نئے سرے سے انہی قدیم بنیادوں پر بیت اللہ کی تعمیر شروع کی تھی تو اس

وقت حضور اکرم ﷺ بھی اس تعمیر میں شریک تھے اور اینٹیں اٹھا اٹھا کر لاتے تھے پھر اس میں حجر اسود کی تنصیب بھی آپ کے دست مبارک سے ہوئی۔

حضرت سلیمان علیہ السلام نے اپنے عہد نبوت و سلطنت میں جنات سے بیت المقدس تعمیر کروایا تھا چنانچہ حضرت سلیمان علیہ السلام اور ان کے بعد اکثر انبیائے بنی اسرائیل کے لئے بیت المقدس کو قبلہ قرار دیا گیا جبکہ آپکے والد حضرت داؤد علیہ السلام کا قبلہ بیت اللہ تھا۔

معارف قرآن کی ایک تحریر کا خلاصہ یہ ہے کہ حضرت صالح علیہ السلام کا قبلہ بھی بیت اللہ ہی تھا حالانکہ صالح علیہ السلام کی مسجد بیت المقدس کے قریب ایک پہاڑ پر واقع تھی مگر اس مسجد کی سمت قبلہ بیت اللہ کی جانب تھی، اسی طرح حضرت موسیٰ علیہ السلام بھی صخرہ بیت المقدس کی طرف نماز پڑھتے تھے (صخرہ وہ پتھر ہے جو بیت المقدس میں مغربی جانب لٹکا ہوا ہے) مگر آپ کا رخ بیت اللہ کی طرف ہی ہوتا تھا۔ (ملخصا معارف القرآن ج ۱ ص ۳۷۵)

یہودیوں نے بیت المقدس کی مغربی سمت کو اپنا قبلہ بنایا ہوا تھا اس لیئے کہ حضرت موسیٰ کو مغرب کی جانب سے ندا آئی تھی جیسا کہ قرآن میں ہے وما کنت بجانب الغربی اذ قضینا الی موسی الامر (اور نہیں تھا تو مغرب کی طرف جب بھیجا ہم نے موسیٰ کی طرف حکم۔ سورۃ القصص آیت ۴۴) جبکہ عیسائیوں نے بیت المقدس کے اس شرقی حصہ کو قبلہ بنایا ہوا تھا جہاں سے حضرت جبرائیل علیہ السلام، حضرت بی بی مریم کے پاس انسانی شکل میں بچے کی بشارت دینے گئے تھے قرآن مجید میں اسی طرف واضح اشارہ دیا گیا ہے واذکر فی الکتب مریم اذ انتبذت من اھلھا مکانا شرقیا (اور ذکر کر کتاب میں مریم کا جب جدا ہوئی اپنے لوگوں سے ایک شرقی مکان میں۔ سورۃ مریم آیت ۱۶) خلاصہ یہ کہ بیت المقدس کا مغربی حصہ یہودیوں کا قبلہ تھا اور مشرقی حصہ عیسائیوں کا قبلہ تھا یعنی بیت المقدس کی شرقی و مغربی سمتیں ان کا قبلہ تھیں۔

مسلمانوں کا قبلہ بیت اللہ شریف کو بنایا گیا، کیونکہ یہ عبادت کے لیئے پہلا گھر ہے جسے لوگوں کے لیئے حضرت ابراہیم و اسماعیل علیہما السلام نے مکہ میں حضرت نوح و حضرت آدم اور ملائکہ کی رکھی گئی بنیادوں پر تعمیر فرمایا تھا۔ جیسا کہ قرآن میں ہے ان اول بیت وضع للناس للذی ببکة مبرکا (سب سے پہلا گھر جو لوگوں کے لیئے بنایا گیا مکہ میں وہ بہت ہی برکت والا ہے۔ القرآن)۔ نیز یہی بیت اللہ خود حضرت ابراہیم اور ان کی ملت کا قبلہ بھی تھا، حضرت اسماعیل کا قبلہ بھی یہی تھا۔ وہ انبیائے بنی اسرائیل کہ جن کا قبلہ بیت المقدس تھا وہ بھی حج کے لیئے بیت اللہ ہی آتے تھے، کیونکہ یہ کعبہ اللہ تعالیٰ کا

حرم ہے جیسا کہ ارشاد باری تعالیٰ ہے جعل الله الكعبة البيت الحرام (اللہ تعالیٰ نے کعبہ کو عزت والا گھر بنایا ہے۔ القرآن) مزید امتیاز یہ کہ یہ بابرکت شہر حضور اکرم ﷺ کا مولد اور مقام بعثت بھی ہے اور یہ وسطِ زمین میں ہے جبکہ امت محمدیہ کو اللہ تعالیٰ نے امتِ وسط قرار دیا ہے اس لیئے بیت اللہ مسلمانوں کا قبلہ قرار پایا۔

تحویل قبلہ

اسی آیت کے ضمن میں تحویل قبلہ پر گفتگو بھی ضروری ہے کیونکہ اس حوالے سے تین نظریات ہمارے سامنے ہیں ایک یہ کہ نماز فرض ہونے کے بعد مسلمانوں کا قبلہ بیت المقدس قرار دیا گیا پھر ہجرت کے بعد مدینہ میں بھی سترہ ماہ تین دن تک بیت المقدس میں قبلہ رہا آخر ۱۵ رجب بروز پیر یا ۱۵ شعبان بروز منگل ۲ھ کو ظہر یا عصر کی نماز میں بیت اللہ کو مسلمانوں کا قبلہ قرار دیا گیا۔ یعنی تحویل قبلہ ایک مرتبہ ہوئی، دوسرا نظریہ یہ ہے کہ مکہ میں مسلمانوں کا قبلہ بیت اللہ مقرر ہوا ہجرت کے بعد جیسے ہی آپ ﷺ مدینہ پہنچے تو ۱۲ ربیع الاول کو ہی بیت المقدس کو مسلمانوں کا قبلہ بنا دیا گیا۔ سترہ ماہ تین دن بعد پھر بیت اللہ کو مسلمانوں کا قبلہ بنا دیا گیا یعنی تحویل قبلہ دو مرتبہ ہوئی۔ تیسرا نظریہ یہ ہے کہ مکہ میں یا مدینہ میں بیت المقدس کبھی مسلمانوں کا قبلہ نہیں رہا۔ قرآن میں بیت المقدس کو قبلہ بنانے کا حکم نہ صراحتہً ہے نہ اشارۃً ہے۔

نیز یہ کس قدر عجیب بات ہے کہ خود صحابہ کرام اور پھر تابعین عظام میں بھی اس بارے میں اختلاف ہے کہ جب مکہ میں نماز فرض ہوئی تو اس وقت قبلہ بیت اللہ تھا یا بیت المقدس؟ صحیح بخاری کی ایک روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ جب آپ ﷺ مکہ سے ہجرت فرما کر ۱۲ ربیع الاول کو مدینہ تشریف لائے تو آپ نے تقریباً سترہ ماہ تین دن تک بیت المقدس کی طرف منہ کر کے نماز پڑھی مگر اس عرصہ میں آپ کی خواہش ہمیشہ یہ رہی کہ بیت اللہ شریف آپ کا قبلہ ہو جائے (صحیح بخاری ج ۱ص ۱۰،۱۱ مطبوعہ نور محمد اصح المطابع کراچی) اسی طرح حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے منقول ہے کہ مکہ مکرمہ میں بھی اور ہجرت کے بعد سترہ مہینے تک مدینہ منورہ میں بھی حضور اکرم ﷺ کا قبلہ بیت المقدس تھا۔ پھر آپ کو منجانب اللہ، بیت اللہ کی طرف منہ کر کے نماز پڑھنے کا حکم دیا گیا (عمدۃ القاری ج ۱ص ۲۴۰ میں ہے علامہ بدرالدین عینی اسی قول کو ترجیح دیتے ہیں البتہ مکہ مکرمہ میں آپ ﷺ کا عمل اس طرح رہا کہ آپ ﷺ حجرِ اسود اور رکن یمانی کے درمیان نماز پڑھتے تھے تاکہ بیت اللہ بھی سامنے رہے اور بیت المقدس کا بھی استقبال ہو جائے۔ (باضافہ الفاظ و ملخصاً تبیان القرآن ج ۱ص ۵۹۳)۔

دوسرا قول یہ ہے کہ نماز فرض ہونے کے ساتھ ہی حضور اکرم ﷺ کو ان کے جد امجد حضرت ابراہیم علیہ السلام کے قبلہ یعنی بیت اللہ کی طرف منہ کر کے نماز پڑھنے کا حکم دیا گیا اور ہجرت تک بیت اللہ ہی آپ کا قبلہ رہا۔ ہجرت کر کے جب آپ مدینہ تشریف لائے تو یہودیوں کی تالیف قلب کے لیئے (تاکہ وہ اسلام قبول کرلیں) آپ نے اپنے اجتہاد سے یا اللہ تعالیٰ کے دیئے ہوئے اختیار سے یا بقول حضرت ابن عباس بذریعہ وحی سترہ ماہ تین دن تک بیت المقدس کی طرف منہ کر کے نمازیں پڑھیں۔ پھر آپ ﷺ کی خواہش پر ۱۵ شعبان ۲ھ بروز منگل تحویل قبلہ کا حکم نازل ہوا۔ حافظ ابن عبدالبر اسی قول کو ترجیح دیتے ہیں (باضافہ الفاظ و ملخصاً از تبیان القرآن ج ۱ص ۵۹۳)

جس طرح علامہ بدرالدین عینی حضرت ابن عباس کے قول کو ترجیح دیتے ہیں اسی طرح علامہ غلام رسول سعیدی زاد اللہ عمرہٗ بھی حضرت ابن عباس کے قول کو ترجیح دیتے ہوئے لکھتے ہیں تاہم اگر یہ مان لیا جائے کہ مکہ میں آپ کا قبلہ کعبہ تھا تو پھر دوبار قبلہ کا منسوخ ہونا لازم آئے گا اسلیئے محققین کا یہ نظریہ ہے کہ آپ ابتداءً مکہ مکرمہ میں بھی بیت المقدس کی طرف منہ کر کے نماز پڑھتے تھے۔ (تبیان القرآن ج ۱ص ۵۹۳)

البتہ دوسرا قول کہ جسے حافظ ابن عبدالبر ترجیح دیتے ہیں اسکے قائلین یہ دلیل دیتے ہیں کہ قرآن تو اس معاملے میں خاموش ہے حضرت ابن عباس نے جس آیت کو اپنی دلیل بنایا ہے وہ یہ ہے وما جعلنا القبلة التي كنت عليها الا لنعلم من يتبع الرسول (وہ قبلہ کہ جس پر آپ پہلے تھے اسکو ہم نے اسلیئے قبلہ مقرر کیا تھا تاکہ ہم ظاہر کریں کہ کون رسول ﷺ کی اتباع کرتا ہے۔ سورہ بقرہ آیت ۱۴۳) اس آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ تحویل قبلہ مسلمانوں کے لیئے امتحان و آزمائش تھا تاکہ یہ ظاہر ہو جائے کہ کون رسول کا سچا فرمانبردار ہے اور کون پھسلنے والا ہے تو یہ اظہار مدینہ میں ہوا کہ تحویل قبلہ کا حکم نازل ہوتے ہی بعض ضعیف الایمان اور کچھ منافقین یہ الزام لگا کر کہ آپ اپنی قوم کے دین (قبلہ) پر پلٹ گئے ہیں وہ اسلام سے پھر گئے تھے۔ اگر مکہ میں بیت المقدس قبلہ رہا ہوتا تو منافقین یہ نہ کہتے کہ آپ اپنی قوم کے قبلہ پر پلٹ گئے ہیں، نیز اس آیت میں پہلے قبلہ کو ہی دوبارہ قبلہ بنانے کا حکم ہے، اگر مکہ میں پہلے قبلہ بیت المقدس تھا تو کیا مدینہ میں پھر سے اسے دوبارہ قبلہ بنانے کا حکم دیا گیا تھا؟ نہیں ایسا ہرگز نہیں ، بلکہ مکہ میں پہلا قبلہ بیت اللہ ہی تھا۔ مدینہ میں اپنے اجتہاد و اختیار سے بیت المقدس کو قبلہ بنایا گیا پھر دوبارہ آپ کی خواہش پر اللہ تعالیٰ نے بیت اللہ کو قبلہ مقرر فرمایا۔

علاوہ ازیں مدینہ میں بیت المقدس کو قبلہ بنانے کا پس منظر مدینہ کے اہل کتاب کی تالیف

قلب تھا اور موافقت قبلہ کے باعث ان کے اسلام کی طرف مائل ہونے کی توقع تھی، اسی پس منظر کو سامنے رکھا جائے تو پھر مکہ میں قبائل حجاز کی تالیف قلب کے لیے بیت اللہ کو قبلہ بنایا جانا اظہر من الشمس ہے کیونکہ قبائل عرب کم از کم زبان سے اپنے ملت ابراہیم ہونے کا اقرار کرتے تھے، اور ان کی پیروی کے مدعی بھی تھے اور کچھ تو اپنے آپ کو حنفاء ہی کہتے تھے خود حضور اکرم ﷺ بھی اعلان نبوت سے پہلے اپنی طبیعت و فطرت سے ملت ابراہیمی کے مطابق عمل کیا کرتے تھے۔ اعلان نبوت اور نزول وحی کے بعد قرآن مجید نے بھی آپ کی شریعت کو ملت ابراہیم کے مطابق قرار دیا اور آپ کے دین کو دین حنیف کا نام دیا گیا۔ پھر حضرت ابراہیم و اسماعیل کا قبلہ بیت اللہ تھا۔ اسلیئے مکہ میں نماز فرض ہونے کے بعد بیت اللہ کو قبلہ بنانا فطرت کے عین مطابق تھا اور قابل ترجیح بھی ہے اور آیت قرآن وما جعلنا القبلة التی کنت علیھا (القرآن) اس پر دلیل ہے کہ اب ہم نے بیت المقدس کی جگہ آپ کے اسی پہلے قبلہ بیت اللہ کو ہی دوبارہ آپ کو قبلہ بنا دیا ہے۔ نیز توریت میں بھی مبعوث ہونے والے نبی کی ایک صفت کا بیان کی گئی ہے کہ وہ کعبہ کی طرف منہ کر کے نماز پڑھے گا (تبیان القرآن ج ۱ ص ۹۱۳) اگر نماز فرض ہونے کے بعد آپ ﷺ کا قبلہ بیت المقدس مقرر ہوا تھا تو پھر توریت کی مذکورہ پیش گوئی کی کیا تاویل کی جائے گی؟ بہر حال دوسرے نظریہ کے قائلین کے دلائل مضبوط ہیں۔

تیسرا نکتہ نظر یہ ہے کہ تحویل قبلہ کا عمل کبھی ہوا ہی نہیں اس لیئے کہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ ان اول بیت وضع للناس للذی ببکة مبرکا (سب سے پہلا گھر جو لوگوں کے لیئے بنایا گیا مکہ میں وہ بہت ہی برکت والا ہے۔ القرآن)۔ لہذا حضرت آدم علیہ السلام سے قیامت تک یعنی روز اول تا روز آخر بھی بیت اللہ ہی قبلہ ہوگا، نیز آیت کریمہ واذ بوانا لابراھیم مکان البیت (اور جب ہم نے ابراہیم کو بیت اللہ کی جگہ بتادی۔ سورۃ حج آیت ۲۶) اس میں اشارہ ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے یہاں تشریف لانے سے پہلے بیت اللہ موجود تھا اس سے اگلی آیت میں اس اعلان کی تاثیر یہ بتائی گئی ہے یاتوک رجالا علی کل ضامر یاتین من کل فج عمیق۔ (سورۃ حج آیت ۲۷) یہ سلسلہ ہزار ہا سالوں سے آج تک قائم ہے اور قیامت تک قائم رہیگا یعنی جب سے لوگ حج بیت اللہ کے لیئے آرہے ہیں اور آتے رہینگے اس وقت تک (قیامت تک) بیت اللہ ہی قبلہ رہے گا۔ اسی طرح جب سے بیت اللہ کی بنیاد رکھی گئی ہے تب سے قیامت تک بیت اللہ ہی قبلہ رہے گا۔

نیز ما ولھم اور فلنولینک کا معنی تحویل نہیں ہے بلکہ اس کا لغوی معنی تولیت میں دینا ہے جیسا کہ۔۔۔ الولاء' والتوالی کے اصل معنی دو یا دو سے زیادہ چیزوں کا اس طرح یکے بعد

دیگرے آنا کہ ان کے درمیان کوئی ایسی چیز نہ آئے جو ان میں سے نہ ہو، پھر استعارہ کے طور پر قرب کے معنی میں استعمال ہونے لگا خواہ وہ قرب بلحاظ مکان یا نسب ہو یا دوستی و نصرت کے ہو یا بلحاظ اعتقاد ہو۔۔۔ الولایة (بکسر الواو) کے معنی نصرت اور الولایة (بفتح الواو) کے معنی کسی کام کا متولی ہونے کے ہیں۔۔۔۔ بعض نے کہا کہ یہ دلالة اور دلالة کی طرح ہے اس میں دو لغت ہیں اور اس کے معنی ہیں کسی کام کا متولی ہونا، کما قال ابو عبیدہ فی مجازہ (مفردات امام راغب مترجم محمد عبدہ فیروز پوری ج ۲ ص ۱۱۳۰)

تولی۔۔ کا لفظ جب متعدی بنفسہ ہوتا ہے تو اس معنی قریب ترین مقام کی ولایت کا حصول ہوتا ہے (مفردات مترجم محمد عبدہ فیروز پوری ج ۲ ص ۱۱۳۲)

لغت کے مذکورہ حوالوں سے ولھم اور فلنولینک کا معنی ہوا کہ۔۔۔۔ ہم نے آپ کو نگران یا ولی بنایا۔ اور۔۔ پس ہم آپ کو متولی بنادینگے۔۔۔۔ اور اس معنی کی دلیل یہ آیات مبارکہ ہیں ما لکم من ولا یتھم من شی حتی یھاجروا (جب تک وہ ہجرت نہ کریں تمہیں ان کی قربت و تولیت کا کوئی حق نہیں ہے۔) دوسری آیت یہ ہے انما سلطانه علی الذین یتولونه (وہ انہی لوگوں پر سلطان (طاقتور) ہے جو اسے اپنا متولی یا دوست بناتے ہیں) ایک اور آیت ہے ان اولی الناس بابراھیم للذین اتبعوہ (بے شک ابراہیم سے قرب رکھنے والے وہی لوگ ہیں جو ان کی پیروی کرتے ہیں) ان تینوں آیات سے واضح ہوا کہ ولھم اور فلنولینک کا معنی تحویل یا پھیرنا نہیں ہے بلکہ متولی بنانا ہے۔ اب آیت کریمہ فلنولینک قبلة ترضھا کا ترجمہ یہ ہوگا (پس ہم نے آپ کو اسی قبلے کا متولی بنا دیا ہے جس پر آپ راضی ہیں)۔

ہجرت کے بعد مدینہ تشریف لے جا کر جب آپ نے بیت اللہ کو قبلہ بنایا تو مدینہ کے یہود و نصاریٰ نے کہا کہ جب آپ ہمارے نبی کو، ہماری شریعتوں اور کتابوں کو (ان کی اسی اصلی حالت میں جیسا کہ وہ نازل ہوئی تھیں) مانتے ہیں تو پھر چاہیے کہ قبلہ بھی ہمارا ہی اختیار کریں، ہمارا قبلہ تو بیت المقدس ہے ان کے جواب میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا سیقول السفھاء من الناس ما ولھم عن قبلتھم التی کانوا علیھا (عنقریب بے وقوف لوگ کہیں گے انہیں ان کے قبلے کا متولی کس نے بنا دیا کہ جس پر وہ پہلے تھے۔ سورۃ بقرہ آیت ۱۴۲) یعنی مدینہ میں بھی آپ ﷺ کا قبلہ بیت اللہ ہی تھا جس پر وہاں کے یہود و نصاریٰ نے اعتراض کیا تھا۔

مزید یہ کہ تحویل قبلہ کے مسئلے کو سمجھنے کے لیئے سورۂ فیل اور سورۂ قریش کو سمجھنا ضروری ہے

کیونکہ یہ دونوں سورتیں مکہ کے ابتدائی دور کی ہیں اور نزول کے اعتبار سے ان کا شمار ۱۹ اور ۲۰ ہے ان میں قریش کو یاد دلایا جارہا ہے کہ تمہاری عزت، عظمت اور دنیاوی شوکت و وجاہت، نیز تمہارا امن و سکون سے رہنا و دیگر قبائل عرب کا تم سے نہ لڑنا، شام و یمن کے سفروں میں تمہارے تجارتی قافلوں کا ڈاکوؤں، لٹیروں سے محفوظ رہنا، بھوک و قحط سالی میں تمہیں کھانا ملنا اور خوف کے ایام میں امن سے رہنا اسلیئے تھا کہ تم بیت اللہ کے متولی تھے، پھر ابرہہ کے لشکر کے مقابلے سے تم عاجز تھے آخر اللہ نے ہی مافوق العادت اپنے گھر کی حفاظت فرمائی تھی اور تمہاری عزت و شوکت کو قائم رکھا تھا اور اب ہم نے اپنے محبوب پیغمبر کو اس گھر کا متولی بنا کر بھیجا ہے اور انہی کے ذریعے ہم اپنے گھر کی بتوں اور بت پرستی سے حفاظت فرمائیں گے لہٰذا مذکورہ احسانات برائے قریش مکہ فلیعبدوا رب ھذا البیت (تم اس کی عبادت کرو جو اس گھر کا رب ہے۔ سورۂ قریش)

اب اس میں کیا تطبیق دی جاسکتی ہے کہ مکہ کے ابتدائی دور میں اللہ تعالیٰ قریش مکہ کو تو یہ حکم فرمائیں کہ تم محمد کی دشمنی اور بتوں کی پرستش چھوڑ کر خانہ کعبہ میں، خانہ کعبہ کے رب کی عبادت کرو اور پھر خود پیغمبر اسلام کو یہ حکم دیا گیا ہو کہ آپ اپنی نمازوں کے لیئے بیت المقدس کو قبلہ بنائیں؟ بہر حال یہ امر مسلم ہے کہ بیت المقدس میں آپ کی مکہ و مدنی زندگی میں کبھی قبلہ نہیں رہا۔ اور قرآن مجید میں بھی اس کا کوئی تذکرہ نہیں ہے جبکہ احادیث میں بھی بیت المقدس کے قبلہ ہونے میں تضاد ہے جیسا کہ نظریہ نمبر ایک اور دو سے واضح ہے۔ علاوہ ازیں مذکورہ آیات واضح بتارہی ہیں کہ بیت اللہ شریف اللہ تعالیٰ کی عبادت کے لیئے پہلا گھر ہے، جو قبلہ کی حیثیت سے قائم ہوا اور قیامت تک قائم رہے گا۔ جبکہ بیت المقدس کو عبادت کے ایک مرکز و مقام کی حیثیت حاصل ہے۔ جہاں بعض انبیائے بنی اسرائیل اپنی امتوں کے ساتھ اکٹھے ہو کر عبادت کیا کرتے تھے لیکن قبلہ بیت اللہ ہی تھا۔

چوتھا نکتۂ نظر یہ ہے کہ مکہ میں نماز کی فرضیت کے بعد مسلمانوں کا قبلہ بیت اللہ تھا، مگر ہجرت سے کچھ پہلے آپ کو بیت المقدس کو قبلہ بنانے کا حکم ملا، جیسا کہ مفتی محمد شفیع صاحب لکھتے ہیں۔۔ حضرت خاتم الانبیاء ﷺ پر جب نماز فرض کی گئی تو بقول علماء ابتداء آپ ﷺ کا قبلہ آپ کے جد امجد حضرت ابراہیم علیہ السلام کا قبلہ یعنی خانہ کعبہ ہی قرار دیا گیا۔ مکہ مکرمہ سے ہجرت کرنے اور مدینہ طیبہ میں قیام کے بعد اور بعض روایات کے اعتبار سے ہجرت مدینہ سے کچھ پہلے آپ کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے حکم ہوا کہ آپ بیت المقدس کو اپنا قبلہ بنائیے۔ (معارف القرآن ج ۱ ص ۳۶۲)

لطیف نکتہ۔ متعدد مفسرین کرام کے رشحات قلم کا خلاصہ یہ ہے کہ حضور اکرم ﷺ مکہ میں حجر اسود اور رکن

یمانی کے درمیان نماز ادا کرتے تو استقبال بیت اللہ کے ساتھ ساتھ بیت المقدس بھی رو برو ئے نظر ہوتا تھا۔ اسی طرح انبیائے بنی اسرائیل بھی (جن کا قبلہ بیت المقدس تھا) اپنی عبادتوں کا قبلہ اگرچہ بیت المقدس کو بناتے تھے مگر بیت اللہ بھی ان کے سامنے ہوا کرتا تھا چنانچہ صاحب معارف القرآن، تفسیر قرطبی سے نقل کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

اور بقول ابو العالیہ انبیاء سابقین جو بیت المقدس میں نماز پڑھتے تھے وہ بھی ایسا عمل کرتے تھے کہ صخرۂ بیت المقدس بھی سامنے رہے اور بیت اللہ بھی (معارف القرآن ج ۱ ص ۳۶۲)

اسی طرح مفتی احمد یار خاں نعیمی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ تفسیر عزیزی اور تفسیر احمدی کے حوالے سے لکھتے ہیں: جب تک مکہ مکرمہ میں قیام رہا بیت المقدس ہی کی طرف نماز ہوتی رہی مگر کعبہ معظمہ کو سامنے لے کر یعنی بیت المقدس کی طرف اس طرح منہ کرتے کہ کعبہ معظمہ بھی سامنے آجاتا (تفسیر نعیمی سورۂ بقرہ زیر آیت ۱۴۲)

بہر حال تحویل قبلہ کے حوالے سے چاروں نکتۂ نظر تحریر کردیئے گئے ہیں جبکہ میری ترجیح دوسرا نکتۂ نظر ہے نیز موضوع سخن میں ہکل ایۃ کا مفہوم یہ ہے کہ اے رسول ﷺ ہم نے آپ کو قبلہ (خانہ کعبہ) کا متولی بنادیا ہے۔ یہ اہل کتاب آپ کے قبلہ (بیت اللہ) کی پیروی نہیں کرینگے چاہے ان کو ہر قسم کی تمام نشانیاں ہی کیوں نہ دکھلادیں، جب یہ اہل کتاب یہود و نصاریٰ آپس میں ایک قبلہ پر متفق نہیں ہیں تو آپ کی پیروی پر کیسے متفق ہو نگے؟ اسی طرح آپ بھی ان کے قبلوں کی پیروی نہیں کرسکتے کیونکہ ان کے قبلے الگ الگ یعنی بیت المقدس کی مشرقی اور مغربی سمتیں ہیں، یہ سب کچھ جاننے کے بعد جو بھی یہود و نصاریٰ کی پیروی میں ان سمتوں کو قبلہ بنائے گا وہ اپنے آپ سے ناانصافی اور ظلم کرے گا۔ واللہ علم بالصواب

....

قرآن وسنت کی عظمت واتباع نہج البلاغہ کی روشنی میں

ڈاکٹر محمد شکیل اوج
استاذ الفقہ والتفسیر، شعبہ علوم اسلامی، جامعہ کراچی

۱۴ اگست ۲۰۰۶ء بروز پیر، اہل تشیع کے قدیم بلکہ کراچی کے اولین آفاقی مدرسے "جامعہ امامیہ" (ناظم آباد) (قائم شدہ ۱۸ جولائی ۱۹۵۶ء) میں نہج البلاغہ کی علمی وادبی عظمت کے عنوان سے ایک سیمینار منعقد ہوا۔ اس سیمینار میں شعبہ علوم اسلامی، جامعہ کراچی کے چیئر مین پروفیسر مولانا غلام مہدی، مولانا ظفر حسن نقوی، مولانا مشتاق حسین شاہدی، مولانا اصغر درس، پروفیسر سید سبط جعفر زیدی، اور مولانا قمبر علی قمری نے اپنے اپنے انداز میں خطبات پیش کیے۔ راقم بھی اس سیمینار میں مقرر کی حیثیت سے مدعو تھا۔ سیمینار میں بتایا گیا کہ آج سے ۳۲ سال پہلے بھی اس مقام پر نہج البلاغہ کے عنوان سے ایک سیمینار منعقد ہوا تھا۔ جس میں شیعہ علماء کے ساتھ اہلسنت کے نامور عالم اور جامعہ کراچی میں کلیۂ معارف اسلامیہ کے سابق رئیس پروفیسر مولانا منتخب الحق قادری مرحوم بحیثیت مقرر شریک ہوئے تھے۔ اور اب ایک طویل مدت کے بعد اسی عنوان سے ایک بار پھر کچھ علماء اور اسکالرز کو مدعو کیا گیا ہے۔ اس موقع پر راقم نے جو خطاب کیا وہ ذیل میں نذر قارئین ہے۔

معزز علمائے کرام وسامعین محترم!

جامعہ امامیہ میں، نہج البلاغہ کے تعلق سے ہونے والی تقریب میں اپنی شرکت کو میں ایک اعزاز سمجھتا ہوں۔ موضوع کی مناسبت سے میں نے جو گفتگو کرنی ہے اس کا عنوان ہے "قرآن وسنت کی عظمت واتباع نہج البلاغہ کی روشنی میں"۔ نہج البلاغہ، حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے منسوب خطبات کا ایک عظیم وادبی شاہکار سمجھا جاتا ہے۔ بہر حال قرآن وسنت سے اپنے خصوصی تعلق کے پیش نظر میں نے

نہج البلاغہ کے ایک ایسے ہی خطبہ کو اپنی گفتگو کے لیے منتخب کیا ہے جس میں حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ قرآن وسنت کی عظمت کو بیان فرما رہے ہیں۔ یہ خطبہ نہج البلاغہ کی جلد اول میں موجود ہے۔ جس کا نمبر شمار ۱۰۸ ہے۔ میں اس خطبے کے آخری حصے کو یہاں بعینہ نقل کروں گا۔ پھر اس کا وہ ترجمہ پیش کروں گا۔ جو مولانا مفتی جعفر حسین مرحوم نے کیا ہے۔ بعدہ اس خطبہ کا اپنے ترجمہ کی زبان میں بھی پیش کروں گا۔ اصل خطبہ ملاحظہ ہو:

افیضوا فی ذکر اللّٰہ فانہ احسن الذکر، وارغبوا فیما وعد المتقین فان وعدہ اصدق الوعد، واقتدوا بہدی نبیکم فانہ افضل الھدی، واستنوا بسنتہ فانھا اھدی السنن، وتعلموا القرآن فانہ احسن الحدیث وتفقھوا فیہ، فانہ ربیع القلوب، واستشفوا بنورہ، فانہ شفاء الصدور، واحسنوا تلاوتہ فانہ احسن القصص، فان العالم العامل بغیر علمہ کالجاھل الحائر الذی لا یستفیق من جھلہ بل الحجۃ علیہ اعظم والحسرۃ لہ الزم وھو عند اللّٰہ الوم۔

(نہج البلاغہ، جلد اول، خطبہ نمبر ۱۰۸ کا آخری حصہ، صفحہ نمبر ۳۱۶، اردو ترجمہ مولانا مفتی جعفر حسین، امامیہ کتب خانہ، مغل حویلی اندرون موچی دروازہ لاہور، اضافہ شدہ ایڈیشن، سنہ اشاعت درج نہیں)

مفتی جعفر حسین کا ترجمہ ملاحظہ کیجئے:

اللہ کے ذکر میں بڑھے چلو، اس لیے کہ وہ بہترین ذکر ہے اور اس چیز کے خواہشمند ہو کہ جس کا اللہ نے پرہیزگاروں سے وعدہ کیا ہے اس لیے کہ اس کا وعدہ سب وعدوں سے زیادہ سچا ہے، نبی کی سیرت کی پیروی کرو کہ وہ بہترین سیرت ہے اور انکی سنت پر چلو کہ وہ سب طریقوں سے بڑھکر ہدایت کرنے والی ہے اور قرآن کا علم حاصل کرو کہ وہ بہترین کلام ہے اور اسمیں غور وفکر کرو کہ یہ دلوں کی بہار ہے اور اسکے نور سے شفاء حاصل کرو کہ سینوں (کے اندر چھپی ہوئی بیماریوں) کے لیے شفا ہے اور اسکی خوبی کے ساتھ تلاوت کرو کہ اس کے واقعات سب واقعات سے زیادہ فائدہ رساں ہیں۔ وہ عالم جو اپنے علم کے مطابق عمل نہیں کرتا اس سرگرداں جاہل کے مانند ہے جو جہالت کی سرمستیوں سے ہوش میں نہیں آتا، بلکہ اسپر (اللہ کی) حجت زیادہ ہے اور حسرت وافسوس اس کے لیے لازم وضروری ہے اور اللہ کے نزدیک وہ زیادہ قابل ملامت ہے۔

اور اب راقم کا ترجمہ ملاحظہ کیجئے:

قانون خداوندی کی طرف بڑھو کیونکہ یہ بہترین قانون ہے اور اس چیز کے طالب بنو جس کا متقین (یعنی غلط راہ کے خطرات سے محفوظ ہونے والوں) سے وعدہ کیا گیا ہے بلاشبہ اس کا وعدہ تمام

وعدوں سے زیادہ سچا ہے اور اپنے نبی ﷺ کی سیرت کی پیروی کرو۔ کیونکہ یہ سب سے اعلیٰ سیرت ہے۔ اور انکی سنت کو اپناؤ کیونکہ انکی سنت تمام سنتوں سے زیادہ ہدایت یافتہ اور سب سے بڑھکر ہدایت رساں ہے۔ اور قرآن کا علم حاصل کرو کیونکہ یہ بہترین کلام ہے اور اسمیں خوب فہم وبصیرت حاصل کرو، کیونکہ یہ دلوں کی بہار ہے، اور اس کے نور سے شفا حاصل کرو، کیونکہ یہ سینوں میں پیدا ہونے والی تمام بیماریوں کے لیئے شفاء ہے اور اسکی پیروی بہترین انداز سے کرو، کیونکہ اسمیں تمہارے لیئے بہترین نشانات قدم کی اتباع کا سامان موجود ہے، بے شک قرآنی علم کے سوا (کسی اور پر) عمل کرنے والا عالم اس پریشان و سرگرداں جاہل کی طرح ہے جو اپنے جہل کی مستی سے باہر نہیں نکلا۔ جبکہ (قرآن اور اسکی تعمیل) اس پر سب سے بڑی حجت ہے (اس لیئے) حسرت ویاس اس کے لیئے لازم ہے اور اللہ کے نزدیک وہ سب سے زیادہ قابل ملامت بھی ہے۔

اس خطبے کے ایک ایک لفظ سے قرآن وسنت کی ضرورت واہمیت اور انکی عظمت کا اندازہ بخوبی لگایا جاسکتا ہے۔ خصوصاً خطبہ کا یہ جملہ بار بار پڑھے جانے کے لائق بلکہ قابل حفظ ہے:

وتعلموا القرآن فانه احسن الحديث و تفقهوا فيه ۔

دراصل یہی وہ جملہ ہے کہ جس نے مجھے اس خطبے کے انتخاب پر انگیخت کیا اس جملہ میں قرآن، حدیث اور فقہ تینوں الفاظ اکٹھے ملتے ہیں۔ اسمیں قرآن مجید کو احسن الحدیث کہا گیا ہے اور یہ وہی بات ہے، جو قرآن میں ایک جگہ اس طرح آئی ہے۔ اللہ نزل احسن الحديث (زمر/۲۳) اللہ نے بہترین کلام نازل فرمایا ہے۔

اور وتفقهوا فيه میں وضمیر قرآن کی طرف راجع ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ فقہ کا ماخذہ مصدر قرآن مجید ہی ہے۔ بالفاظ دیگر کہا جاسکتا ہے کہ قرآن حدیث بھی ہے اور فقہ کا موضوع بھی۔ گو فقہ اہلسنت میں ادلۂ اربعہ، قرآن، حدیث، اجماع اور قیاس بیان کیئے گئے ہیں۔ اور ان سب کو اپنی اپنی جگہ ایک مستقل دلیل کی حیثیت دی گئی ہے۔ مگر حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اپنے خطبے میں قرآن کو حدیث بلکہ احسن الحدیث کہہ کر گویا اسے عرفی حدیث سے ممتاز اور نمایاں کردیا ہے، جیسا کہ ایک جگہ خود قرآن کریم میں فرمایا گیا ہے۔

فبای حديث بعده يومنون۔ (المرسلت/۵۰) پھر وہ اس کے بعد کسی کلام پر ایمان لائیں گے۔

مطلب یہ کہ قرآن ہی اصل حدیث ہے۔ جو اپنی حقانیت میں کسی سند کا محتاج نہیں ہے۔ قرآن مجید سے معلوم ہوتا ہے کہ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کی کوئی حدیث، خواہ قولی ہو یا فعلی، قرآن سے

متعارض نہیں ہو سکتی، کیونکہ حدیث (روایت) کی پرکھ کا سب سے بڑا معیار خود قرآن کریم ہے۔ جسمیں بتایا گیا ہے۔

واذا تتلیٰ عليهم اياتنا بينٰت قال الذين لا يرجون لقاءنا ائت بقرآن غير هذا او بدله ط قل ما يكون لى ان ابدله من تلقآئ نفسى ج ان اتبع الا ما يوحىٰ الى ج انى اخاف ان عصيت ربى عذاب يوم عظيم۔ (یونس/۱۵)

اور جب ان پر واضح احکام پیش کئے جاتے ہیں تو وہ لوگ جو ہم سے ملاقات کے آرزومند نہیں کہتے ہیں کہ آپ اس کے سوا کوئی اور قرآن لے آیئے یا (اسکے احکام کو) بدل دیجئے۔ آپ فرما دیجئے کہ مجھے کیا حق پہنچتا ہے کہ میں اسے اپنی خواہش سے بدل دوں۔ میں تو اس وحی کی پیروی کا پابند ہوں۔ جو مجھ پر کی جاتی ہے اگر میں اپنے رب کی نافرمانی کروں تو میں ایک بڑے دن کے عذاب سے ڈرتا ہوں۔

اس آیت سے صاف پتہ چلتا ہے کہ قرآن ہی احسن الحدیث ہے۔ اس لیئے تو خطبہ علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ میں، تفقهوا فيه میں فقہ کا موضوع فقط قرآن کو بتایا گیا ہے کیونکہ فیہ میں وضمیر واحد قرآن کی طرف راجع ہے اور یہ وہی بات ہے جو سورۂ توبہ میں اس طرح آئی ہے:

وماكان المومنون لينفروا كافة فلولا نفر من كل فرقة منهم طائفة ليتفقهوا فى الدين ولينذروا قومهم اذا رجعوا اليهم لعلهم يحذرون۔ (التوبہ/۱۲۲)

اور یہ تو ہو نہیں سکتا کہ سارے کے سارے مسلمان ایک ساتھ نکل کھڑے ہوں تو ایسا کیوں نہ ہوا کہ ان کے ہر گروہ میں سے ایک حصہ نکل کر آئے تا کہ وہ دین میں تفقہ (یعنی خوب فہم وبصیرت) حاصل کرے۔ اور واپس جا کر اپنی قوم کو ڈرائے تا کہ وہ لوگ بھی (غلطی کرنے سے) بچیں۔

آیت میں ليتفقهوا فى الدين کے الفاظ آئے ہیں اور خطبہ علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ میں تفقهوا فيه، کے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ قرآن میں تفقہ دراصل دین میں تفقہ ہے۔ گویا قرآن دین کا دوسرا نام ہے۔ اور حقیقت بھی یہی ہے کہ دین کی اقامت، قرآن کے ذریعہ ہوتی ہے۔ خدانخواستہ اگر قرآن کی نفی کردی جائے تو پھر دین کا وجود ہی ختم ہو جائے گا۔ اس لیئے ہمارے غور وفکر اور تعقل وتدبر کا سامان قرآن کریم میں رکھ دیا گیا ہے۔ بایں معنیٰ کہا جاسکتا ہے کہ عصر حاضر میں پیش آمدہ مختلف فقہی معاملات ومسائل کو قرآن کی روشنی میں دیکھنا چاہیئے تا کہ قرآن سے مستخرج اور مستنبط فقہ مسلمانوں کے علمی وفکری اتحاد کا ذریعہ بن سکے۔

آیت میں مذکور تفقه فی الدین کا مفہوم دورِ رسالت مآب ﷺ میں جو سمجھا گیا تھا وہ کچھ اور تھا کیونکہ اس وقت معروف معنی میں کوئی فقہ موجود نہ تھی۔ اور اب تفقہ فی الدین کسی اور چیز سے عبارت ہے۔ یہ امر ہم سب کے لیے لائق توجہ ہے۔

اب میں ان پہلوؤں کو بیان کروں گا جو میں نے اپنے ترجمے میں اختیار کیے ہیں:

افیضوا فی ذکر اللہ فانہ احسن الذکر۔ میں ذکر سے مراد میں نے قانون خداوندی کو لیا ہے۔ خدا کا قانون، چونکہ مختلف احکام کے مجموعے پر مشتمل ہے۔ اس لیے اس جملہ کا ترجمہ میں نے بایں الفاظ کیا ہے۔ قانون خداوندی کی طرف بڑھو، کیونکہ یہ بہترین قانون ہے۔ میرے اس ترجمے کی تائید خطبے کے اگلے جملے سے بخوبی ہوتی ہے جسمیں کہا گیا ہے وارغبوا فیما وعد المتقین یعنی اس چیز کے طلب گار بنو جس کا متقین سے وعدہ کیا گیا ہے۔ قرآن کی زبان میں متقین انہیں کہا جاتا ہے جن کے اعمال صالح ہوں۔ اس لیے جملہ سابقہ میں ذکر اللہ سے قانون خداوندی کو مراد لینا نظم عبارت کے پہلو سے زیادہ مناسب معلوم ہوتا ہے۔ اسی طرح واستنوا بسنته فانها اهدى السنن میں اهدىٰ کا ترجمہ میں نے اسم تفضیل کی رعایت میں نیز حضور نبی پاک ﷺ کی سنت کی عظمت کے پیش نظر دوہرے مفہوم پر مشتمل الفاظ سے ادا کیا ہے۔ خطبہ علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ میں ادا ہونے والا لفظ "اهدیٰ" دراصل مبنی للمفعول بھی ہے اور مبنی للفاعل بھی۔ کیونکہ اسم تفضیل جیسے اسم فاعل کے لیے آتا ہے۔ ویسے ہی اسم مفعول کے لیے بھی آتا ہے۔ حالتِ فاعلی میں اسکے معنی ہوتے ہیں بہت زیادہ ہدایت دینے والا اور حالتِ مفعولی میں اسکے معنی ہوتے ہیں۔ بہت زیادہ ہدایت یافتہ۔ اور یہاں یہ لفظ مجھے دونوں معنی کا جامع دکھائی دیتا ہے۔ کیونکہ یہ کلام جس سے ادا ہوا ہے۔ اور جس کے لیے ادا ہوا ہے وہ دونوں ہستیاں اپنی اپنی جگہ انتہائی شان جامعیت کی حامل ہیں۔ اس لیے ضروری ہے کہ میں اسے دونوں طرح سے نمایاں کروں۔ چنانچہ میں نے اس کا ترجمہ بایں الفاظ ادا کیا ہے۔ اور اسکی سنت کو اپناؤ کیونکہ اسکی سنت، تمام سنتوں سے زیادہ ہدایت یافتہ اور سب سے بڑھ کر ہدایت رساں ہے۔ واحسنوا تلاوته فانه احسن القصص (خطبہ علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ) اس جملہ میں تلاوۃ کے مفہوم کی ادائیگی خود تلاوت کے لفظ سے کی گئی ہے۔ جبکہ میں اپنے ترجمے میں تلاوت کے معنی پیروی کرنے، پیچھے پیچھے چلنے کے بیان کیے ہیں۔ اس معنی کی سند ہمیں قرآن کی اس آیت سے ملتی ہے والقمر اذا تلٰها (الشمس/۲) اور چاند کی شہادت کہ جب وہ سورج کے پیچھے پیچھے چلے۔ اور احکام کی پیروی واتباع کی مثال کے لیے یہ آیت دیکھیے:

الذین اٰتینٰهم الکتاب یتلونه حق تلاوته اولٰئک یومنون به۔ (البقرہ/۱۲۱)

وہ لوگ کہ جنہیں ہم نے کتاب دی وہ اسکی پیروی کرتے ہیں جیسا کہ اسکی پیروی کا حق ہے اور یہی وہ لوگ ہیں جو اسپر ایمان لاتے ہیں۔

ظاہر ہے کہ یہاں تلاوت کے معنی پیروی کرنے کے سوا کچھ اور ہو ہی نہیں سکتے۔ کیونکہ اس میں تلاوت کرنے والوں کو "یومنون بہ" کے الفاظ سے یاد کیا گیا ہے۔ اگر یہاں تلاوت کا مفہوم فقط پڑھنا لیا جائے تو لازم آئے گا کہ اسکی تلاوت کرنے والے، ہر حال میں اس پر ایمان بھی لائیں۔ جبکہ مستشرقین اور غیر مسلم دانشوروں کی ایک معتدبہ تعداد قرآن کریم کو پڑھتی تو ہے مگر دولت ایمان سے بہرہ ور نہیں ہوتی۔ اس سے پتہ چلتا ہے کہ آیت مذکورہ میں تلاوت کا مفہوم پیروی واتباع ہے نہ کہ فقط پڑھنا۔

اس طرح احسن القصص کا مفہوم میں نے بہترین نشانات قدم کی اتباع سے ادا کیا ہے اور زجاج نے بھی اس کا معنی اتباع الاثر سے بیان کیا ہے۔ قص دراصل کسی کے نقش قدم پر چلنے کو کہا جاتا ہے اس مادہ کے بنیادی معنی کسی چیز کا پیچھا کرنے اور جستجو کرنے کے ہوتے ہیں جیسا کہ قرآن کریم میں آتا ہے۔ وقالت لاخته قصیه فبصرت به عن جنب وهم لا یشعرون۔ (القصص/۱۱) اور موسیٰ علیہ السلام کی والدہ نے ان کی بہن سے کہا کہ ان کا حال معلوم کرنے کے لیے انکے پیچھے پیچھے جاؤ، پس وہ انہیں دور سے (پیچھا کرتے ہوئے) دیکھتی رہی اور وہ لوگ اس امر سے بالکل بے خبر رہے۔ سورۂ کہف میں آتا ہے۔

قال ذلک ما کنا نبغ فارتدا علیٰ اثارهما قصصا۔ (الکہف/۶۴)

موسیٰ علیہ السلام نے کہا یہی وہ مقام ہے جو ہمارا مطلوب تھا، پس وہ دونوں اپنے نشانات قدم پر وہی راستہ تلاش کرتے ہوئے اسی مقام مطلوب پر واپس پلٹ آئے۔

ان قرآنی تائیدات وشہادات کی روشنی میں میں نے جملہ مذکورہ کا ترجمہ بایں الفاظ ادا کیا ہے۔ اور اسکی پیروی بہترین انداز سے کرو کیونکہ اسمیں تمہارے لیے بہترین نشانات قدم کی اتباع کا سامان موجود ہے۔

معزز سامعین کرام! میں نے اپنی گفتگو میں انتہائی اختصار سے کام لیا ہے۔ امید کرتا ہوں کہ نہج البلاغہ کی علمی وادبی عظمت کے ضمن میں میرے مختصر اظہار رائے کو کسی بڑی کوشش کی تمہید سمجھا جائے گا۔

واخر دعونا ان الحمد للہ رب العلمین۔

آزادیٔ نسواں کا مغربی تصور

مریم ناز
رکن مجلس التفسیر

عورت بنی نوع انسان کی تعمیر کا پہلا مکتب ہے۔ عورت جسکی کوکھ سے پیغمبروں نے جنم لیا، بڑے بڑے موحد اور محقق اسکی کوکھ میں پلے صدیوں سے جسمانی و روحانی طور پر پامال ہوتی رہی ہے۔ حقوق انسانی سے تہی داماں، شرف انسانی سے فارغ بلکہ حق زندگی سے محروم، اور خود مختاری تو کجا خود کو انسان سمجھنا اس کیلئے شجر ممنوعہ تھا۔ اسکی پوری تاریخ مظلومیت کی داستان ہے۔ حد یہ کہ مختلف زمانوں میں خدا کی طرف سے نیکی و شرافت، سیرت و کردار اور عفت و عصمت کی جو تعلیم آتی رہی رفتہ رفتہ اسکا مطلب بھی یہ سمجھا جانے لگا کہ عورت سے تعلق ہی نہ رکھا جائے۔ یونان ہو یا روم، عرب ہو یا عجم، یورپ ہو یا ایشیا ہر جگہ عورت مظلوم رہی۔ اسکی پوری تاریخ مظلومیت کی داستان ہے۔ خود قرآن نے اسکی مظلومیت کی گواہی دی ہے۔

'جب ان میں سے کسی کو لڑکی کی خبر دی جاتی ہے تو اسکا چہرہ سیاہ پڑ جاتا ہے اور وہ غم سے گھٹنے لگتا ہے۔ اس خبر کو وہ اس حد تک برا سمجھتا ہے کہ اپنے آپ کو اپنی قوم سے چھپاتا پھرتا ہے (اور سوچ میں پڑ جاتا ہے کہ) آیا ذلت برداشت کرتے ہوئے اسکو باقی رکھے یا زیر زمین دفن کر دے۔' [1]

مسیحی تہذیب نے عورت کو گناہ کی جڑ گردانا اور تقویٰ اور اخلاق کا تقاضہ سمجھا کہ نکاح ہی نہ کیا جائے۔ اور عورت سے کنارہ کشی اور دوری اختیار کی جائے کیونکہ اس سے ربط و تعلق انسان کو معصیت اور گناہ سے قریب کرتا ہے۔ [2] زمانہ کی رفتار کیساتھ جیسے جیسے یہ تصور بڑھتا گیا عورت سے نفرت و بیزاری میں بھی اسی قدر اضافہ ہوتا چلا گیا۔ اس سے تعلق کو تقویٰ، اور اس سے احتراز کو خدا ترسی کی دلیل سمجھا یا گیا۔ ان تصورات کا اثر عورت کی انفرادی و معاشرتی زندگی پر بھی پڑا۔ اسکو سوسائٹی میں عزت، مرتبہ بلندی کا وہ مقام نہیں ملا، کا جو مرد کو حاصل تھا۔ اسکے وہ حقوق نہیں رہے جو مرد کے تھے۔ اسکی حیثیت ایک ایسے گنہگار اور مجرم کی سی ہوگئی جسے حقارت و ذلت سے دیکھا جاتا ہے۔

خواتین کیلئے چلائی جانے والی تحریکیں اور انکی حقیقت

مسیحی تہذیب میں عورت کی تذلیل کے نتیجے میں حقوق نسواں اور مساوات مرد وزن جیسی تحریکوں کو مغرب میں پنپنے کا موقع ملا۔ 'آزادیٔ نسواں' کی تحریک برطانیہ میں سب سے پہلے اٹھارویں صدی میں اٹھی۔ اس سلسلے میں پہلی کتاب 1792 میں 'A Vindication of Right of Women' کے عنوان کے تحت لکھی گئی۔ اس کے بعد اس تحریک کو اتنے زور و شور سے اٹھایا گیا کہ بیسویں صدی کے آغاز تک یہ پوری دنیا کو اپنی لپیٹ میں لے چکی تھی۔ 1948 میں 'حقوق نسواں کمیشن' کے نام سے اقوام متحدہ کا ایک ذیلی ادارہ قائم کیا گیا۔ جبکہ خواتین کی پہلی عالمی کانفرنس 1975 میں میکسیکو میں ہوئی اور 'مساوات مرد وزن' اور 'عورت کی ترقی' کیلئے قراردیں پاس کی گئیں۔ عالمی کانفرنسوں کا انعقاد، 'خواتین کا سال' اور 'حقوق نسواں' کا عالمی دن منانے کے ساتھ ساتھ ایک اہم پیش رفت 1979 میں Convention for Elimination of Discrimination Against Women (CEDAW) کے ذریعے ہوئی۔ اس میں یہ طے پایا کہ عورت اور مرد کو مساوات اور برابری کے مقام پر لانے کیلئے ہر طرح کے امتیاز کو ختم کیا جائے۔ یاد رہے کہ نیو ورلڈ آرڈر کا ایک مقصد یہ بھی ہے کہ دنیا میں جنسی تمیز ختم کی جائے، آبادی کم کی جائے اور خاندان کے تصور کو ختم کیا جائے۔ اس نئی دنیا میں عورت کا ایک نیا تصور ہے جو ایک گھونسلا (خاندان) بنانے والی نہیں بلکہ ایک آزاد اور خود مختار شخصیت ہے۔ رمز فیلڈ نے ایک مرتبہ ایک پریس کانفرنس میں کہا تھا کہ جوان عورتیں پرانے ملاؤں کے زیر اثر ہیں اور امریکہ انہیں جلد آزادی دلائے گا۔ جہاں برتی سمیر کا انداز، آزادانہ تعلقات، خاندان اور رشتوں کے تصور کا اختتام جلد حقیقت کا روپ دھاریں گے۔ [3]

ظلم کا نتیجہ کبھی اچھا نہیں ہوتا۔ مسیحی تہذیب میں عورت ایک طویل عرصے سے مظلوم چلی آ رہی تھی۔ [2] جب اسکی مظلومیت اپنی انتہا کو پہنچ گئی تو اسکے نتائج بھی انتہائی گھناؤنے روپ میں نمودار ہوئے۔ مغرب میں 'مساوات مرد وزن' کے مسحور کن نعرے کے ساتھ اٹھنے والی 'آزادیٔ نسواں' کی تحریک نے معاشرتی اقدار کو درہم برہم اور خاندانی نظام کو تباہ کر کے رکھ دیا۔ اس بغاوت کے پیچھے عورت کے اندر اپنی حالت کی اصلاح سے زیادہ مرد کی بندشوں سے آزادی اور اس سے انتقام کا جذبہ کارفرما تھا۔ اسلئے اس نے سب سے پہلے اس نظام کو توڑنا شروع کیا جو اسکو مرد کے تابع اور ماتحت رکھتا تھا۔ کسی مسلک و نظریہ کے خلاف ردعمل ہمیشہ اپنی انتہا کو پہنچ کر رہتا ہے۔ چنانچہ مرد کی چیرہ دستی اور ظلم کے خلاف نفرت اور غم و غصہ کے شدید جذبات نے آزادیٔ نسواں کی تحریک کو بھی اپنی حد کے اندر نہیں رہنے دیا اور اسنے عورت کو وہاں پہنچا دیا جہاں عورت، عورت نہیں رہتی بلکہ مرد کا روپ دھار لیتی ہے، حالانکہ یہ ایک مصنوعی لبادہ ہے جو اسنے اوڑھ رکھا ہے۔ دریں اثناء جب مغرب میں تمام اخلاقی اقدار سے آزادی کی ہوا چلی تو مرد نے بھی عورت کے گھر میں رہنے کو اپنے لئے دوہری مصیبت سمجھا۔ ایک طرف تو اسکی ہوسناک طبیعت عورت کی کوئی ذمہ داری قبول کئے بغیر قدم قدم پر اس سے لطف اندوز ہونا چاہتی تھی تو دوسری